مولانا احمد الیاس نعمانی

مسلم تاریخ کے روشن دور میں

خواتین اسلام کا سرگرم دینی کردار

[ہمارے عزیز ولائق خواہرزادے اور مولانا محمد زکریا سنبھلی (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے صاحبزادے مولوی احمد الیاس نعمانی نے حال ہی میں اسلامی تاریخ میں خواتین کے سرگرم کردار کا مطالعہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا، اور پھر ایک تفصیلی مقالے میں اپنے مطالعہ کا حاصل پیش کیا ہے--- اسی مقالے کی یہ پہلی قسط قارئین الفرقان کی نذر کی جارہی ہے۔ امید ہے کہ آپ نہ صرف بغور ملاحظہ فرمائیں گے بلکہ اپنی خواتین اور بچیوں میں اس کردار کی جھلک پیدا کرنے کی سنجیدہ کوشش بھی کریں گے۔ اپنی بہنوں اور بچیوں سے بھی یہ راقم امید کرتا ہے کہ وہ علماء وصلحاء کی نگرانی میں اپنے معاشرہ کی اصلاح اور دین حق کی حفاظت، اشاعت اور اقامت کی عظیم محنتوں میں ضرور سرگرم حصہ لیں گی--- مدیر]

(پہلی قسط)

ہمارے دینی وفکری حلقوں میں شریعتِ اسلامی میں خواتین کے حقوق پر بکثرت گفتگو ہوتی ہے، لیکن بالعموم خواتین کی ذمہ داریوں اور خاندان ومعاشرہ میں ان کے مطلوبہ کردار پر گفتگو نہایت کم اور شاذ ونادر ہی کی جاتی ہے، 'اسلام میں خواتین کا مقام'، 'اسلام اور خواتین' اور 'اسلام میں خواتین کے حقوق' جیسے عنوانات کے تحت ہونے والی گفتگوؤں میں عام طور پر تمام تر توجہ خواتین کے عائلی

(خاندانی) و معاشی حقوق پر ہی رہتی ہے، اسی لیے ایسی اکثر تحریروں میں باپ، شوہر اور بیٹے پر عورت کے حقوق بیان کیے جاتے ہیں، یہ بات بھی بالتفصیل بیان کی جاتی ہے کہ عورت کی ضروریات کی تکمیل کا بوجھ خود اس کے کاندھے پر نہیں ہے، بلکہ اسلام زندگی کے ہر حصہ میں اس کی ذمہ داری کسی مرد پر رکھتا ہے، البتہ اسلام عورتوں کو کسبِ معاش کی اجازت دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسی اکثر گفتگوئیں اور تحریریں خاندان و معاشرہ کے تئیں خواتین کے مطلوبہ کردار پر خاموش ہی رہتی ہیں۔

حالانکہ اسلام کی نگاہ میں عورت کوئی ایسا کمزور اور بے فیض وجود نہیں ہے کہ جس کے چند حقوق ادا کر کے بس اس کی زندگی کسی حد تک بہتر بنا دی جائے، یا جس کے بس چند حقوق تو ہوں لیکن خاندان و معاشرہ کے لیے اس کی ذات میں خیر کا کوئی ایسا پہلو نہ ہو کہ جس کی بنیاد پر اس سے کوئی کردار مطلوب ہو۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل، اور مسلمانوں کی تاریخ کے روشن دور میں خواتینِ اسلام کی سرگرمیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک آئیڈیل مسلم معاشرہ میں خواتین ایک متحرک و سرگرم وجود رکھتی ہیں، ان کے ذمہ بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں، خاندان و معاشرہ کے تئیں ان سے بھی نفع بخش کردار مطلوب ہے۔

مسلم خواتین کی ذمہ داریوں اور ان سے مطلوب کردار کے متعدد پہلو ہیں، جن میں سے کچھ کا تعلق ان کی ذات سے ہے، کچھ ان کے خاندان سے متعلق ہیں، اور ان کی کچھ ذمہ داریاں معاشرہ کے تئیں ہیں، معاشرہ سے متعلق ان کی ذمہ داریوں میں سب سے اہم "دینی ذمہ داریاں" ہیں، ان صفحات میں ہم ان پر ہی گفتگو کریں گے، اور بالخصوص یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں مسلم خواتین کی دینی خدمات اور دینی سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں، امید ہے کہ اس مطالعہ کی روشنی میں ہم آج کی دیندار و دین پسند خواتین کے لیے ایک نہایت مبارک و سرگرم دینی کردار کا لائحۂ عمل طے کر سکیں گے۔

اس سلسلہ میں سب سے واضح، اصولی اور بنیادی راہنمائی قرآن مجید کی اس آیت سے ملتی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ
وَرَسُولَهُ ۚ أُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا
وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيمُ ﴿٧٢﴾ ﴿التوبة: ۷۱-۷۲﴾

(ترجمہ: مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکاۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی، یہی بڑی کامیابی ہے۔)

ان دو آیات میں سے پہلی آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح تمام اہلِ ایمان نماز وزکاۃ اور اللہ ورسول کے دیگر احکام کی اطاعت کے پابند ہیں، اسی طرح مومن مردوں اور عورتوں کی یکساں ذمہ داری 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' بھی ہے، کہ اس آیت میں اسے بھی مومن مردوں کی طرح مومن عورتوں کی صفت بتایا گیا ہے، یہ 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' درحقیقت ایک شرعی اصطلاح ہے، جو اپنے اندر بہت وسعت رکھتی ہے، دینی تعلیم وراہنمائی کے تمام شعبے، دعوت وتبلیغِ دین کی تمام صورتیں بلکہ دینی جدوجہد کی تمام شکلیں اس اصطلاح کے تحت آتی ہیں، اور یہ آیت اسے یکساں طور پر مسلم مردوں اور عورتوں کی ذمہ داری بتاتی ہے۔ اور جو مومن مرد اور عورت اُس ذمہ داری کو نبھائیں اور اس سلسلہ میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کریں اِن آیات میں اُن کو رحمتِ خداوندی کی خوشخبری دی گئی ہے، ان سے سدا بہار باغوں (جنتوں)، پاکیزہ قیام گاہوں اور اللہ کی رضا وخوشنودی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف ہمارے یہاں خواتین کے سلسلے میں 'دین داری' کا جو تصور بالعموم پایا جاتا

ہے اس میں خواتین کو نماز، روزہ، زکاۃ، حج اور تسبیح ومناجات جیسے ذاتی اعمال کا مکلف تو مانا جاتا ہے، لیکن 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے سلسلہ میں خواتین کے سرگرم سماجی کردار کا کوئی تصور ہمارے یہاں (یعنی بالخصوص برصغیر ہندوپاک کے اکثر مستند سمجھے جانے والے دینی حلقوں میں) نہیں پایا جاتا ہے، یا اگر بعض حلقوں میں اس کا احساس وادراک ہے بھی تو عملی طور پر خواتین کے اس نہایت اہم کردار کے عملی نمونے شاذ ونادر ہی ہیں۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور آپؐ کے بعد کی ابتدائی چند صدیوں میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی، تاریخِ اسلامی کے اس روشن وتابناک دور میں ہمیں مسلم معاشرہ کے اندر خواتین کا سرگرم دینی کردار نظر آتا ہے، دعوتِ دین، تعلیم وتلقین، وعظ ونصیحت، صبر واستقامت اور جہاد میں خواتینِ اسلام کے کارہائے نمایاں گو کہ ہمارے یہاں تذکرہ میں نہ ہوں لیکن تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ایسے کارنامے بڑی تعداد میں درج ہیں، ہماری تاریخ کا یہ روشن دور ہر عہد کی خواتین کے لیے بہترین اسوہ پیش کرتا ہے، زیرِ نظر صفحات میں اسی اسوہ کی ایک مختصر سی جھلک دیکھی جاسکتی ہے جس کی روشنی میں وہ اپنے دینی کردار کی صحیح راہِ عمل متعین کرسکتی ہیں۔

پہلی وحی اور پہلی مسلم خاتون کا حیرتناک کردار:

نبوت محمدی کا آغاز غارِ حرا میں نازل ہونے والی پہلی وحی سے ہوا تھا، صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اولین وحی کے نازل ہونے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی تھی، آپ پر کپکپی طاری تھی، ہیبت واضطراب سے جسم لرزاں تھا، اسی کیفیت میں گھر پہنچے، علامہ شبلی کے الفاظ میں: ''آپ گھر تشریف لائے تو جلالِ الٰہی سے لبریز تھے'' (سیرت النبی، ۱/۱۵۶، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۲ء)، جسم پر لرزہ کی اسی کیفیت کی وجہ سے آپ نے گھر میں داخل ہوتے ہی فرمایا: مجھے چادر اڑھادو، مجھے چادر اڑھادو، اہل خانہ نے چادر اڑھادی، تھوڑی دیر میں ہیبت ولرزہ کی یہ کیفیت دور ہوئی تو آپ نے وحی کے نازل ہونے کا پورا واقعہ حضرت خدیجہ کو سنایا، اور فرمایا مجھ کو اپنے سلسلہ میں خوف محسوس ہورہا

ہے، اس موقعہ پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے آپ کو اطمینان دلایا، تسلی دی اور کہا: اطمینان رکھیے، اللہ آپ کے ساتھ کچھ غلط نہ کرے گا، آپؐ راست باز ہیں، صلہ رحم ہیں، اہل حاجت کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں، مہمان نواز ہیں، نیک مقاصد کے حصول میں اور لوگوں کو پیش آنے والی پریشانیوں میں آپ ان کی مدد کرتے ہیں، ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے اللہ آپ کے ساتھ کسی شر کا ارادہ کیوں کر فرمائے گا، پہلے تو انھوں نے یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی، اور پھر مزید اطمینان کے لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ کے ایک بزرگ عالم ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، اس لیے کہ عام اہل مکہ کے برخلاف وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو بلکہ عالم تھے، گویا دین حق پر قائم تھے، وحی کی نوعیت اور فرشتہ کی آمد سے متعلق علم رکھتے تھے، پس ورقہ بن نوفل کا انتخاب حضرت خدیجہ کی ذہانت، معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ کا ایک بہترین ثبوت تھا، ورقہ بن نوفل نے پوری بات سنی، تو کہا: یہ کچھ اور نہیں، وہی فرشتہ تھا جو حضرتِ موسیٰ کے پاس وحی لے کر آتا تھا......

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طاری گھبراہٹ دور ہوئی اور یہ اطمینان و یقین کامل ہوا کہ جو کچھ پیش آیا ہے وہ خوف و اندیشہ کی چیز نہیں، نبوت کا آغاز ہے۔ (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحي، حدیث نمبر: ۳۔ و مسند احمد: مسند الصديقة عائشة، حدیث نمبر: ۲۵۸۶۵۔)

یہ واقعہ پہلی وحی کے وقت کا ہے، یعنی اس وقت کا جب نبوت محمدی کا آغاز ہو رہا تھا، اور ہم نے دیکھا کہ اس نقطۂ آغاز کے وقت بھی رسول خدا کی کیسی مدد ان کی اہلیہ مکرمہ نے کی، کس طرح ان کی دلبستگی کا سامان کیا، یعنی جب نبی آخر الزماں کا آفتابِ رسالت رہتی دنیا تک کے لیے طلوع ہو رہا تھا تو اس وقت ان کی اہلیہ ان کی بہترین مدد و نصرت کا کردار ادا کر رہی تھیں، اللہ ان سے راضی ہو، اور ہمیں جنت میں ان کے ساتھ جمع فرمائے۔

خواتین کاروانِ ایمان و عزیمت کے ہراول دستہ میں:

پھر آپؐ نے اسلام کی جانب دعوت دینی شروع کی، تو مختلف افراد کے اس دعوت کو قبول کر لینے سے ایک کاروانِ ایمان و عزیمت بنتا چلا گیا، اہلِ ایمان کے اس کارواں میں جس طرح مردوں کی ایک تعداد تھی اسی طرح خواتین بھی اس میں شامل تھیں، جنھوں نے نہایت سخت حالات میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت قبول کی اور حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔

آپؐ کی عالی مقام صاحبزادیاں (حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ)، آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ، آپؐ کی چچی حضرت ام فضل، حضرت ابوبکر کی اہلیہ حضرت ام رومان اور صاحبزادی حضرت اسماء، حضرت سمیہ بنت خباط، حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت ام عمارہ نسیبہ بنت کعب مازنیہ، حضرت اسماء بنت سلامہ اور دیگر متعدد خواتین (جن میں سے کچھ کا تذکرہ ابھی آئے گا) ابتدائی برسوں میں ہی اسلام لے آئی تھیں، ان میں سب سے حیرتناک نام دُرَّہ بنت ابی لہب کا تھا، یہ انھیں ابولہب وام جمیل کی بیٹی تھیں جن پر لعنت کے لیے سورۂ مسد (تبت یدا ابی لھب وتب) نازل ہوئی، اور جن کا شمار اسلام ورسولِ اسلام کے عظیم ترین دشمنوں میں ہوتا تھا، اُن کا بھائی عتبہ بھی نہایت موذی تھا، ان کا شوہر حارث بن نوفل بھی دشمنان اسلام میں سے تھا، جو بدر میں کافروں کی جانب سے لڑتے ہوئے قتل ہوا، اس کے قتل کے بعد حضرت دُرَّہ نے مدینہ ہجرت کی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت دحیہ کلبی سے کرایا [**الاصابة في تمييز الصحابة**، ابن حجرؒ، ۸/۱۲۷-۱۲۸، مطبوعہ: دار الکتب العلمیۃ، بیروت]۔

صبر واستقامت کی چند مثالیں:

یہ ابتدائی زمانہ ایمان قبول کرنے والوں کے لیے نہایت مشکل اور صبر آزما تھا، قریشِ مکہ کو کسی کا اسلام قبول کرنا نہایت ناگوار گزرتا، اور جس پر بس چلتا وہ اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر آزاد وباحیثیت صحابہ پر تو ان کا بس نہ چلتا کہ ان کے قبیلے ان کے محافظ ہو جاتے، لیکن جو غلام اور باندیاں یا اسی طرح جو کمزور و بے آسرا اسلام لے آتے ان کو یہ اپنے طیش وغضب کا نشانہ بناتے، بری طرح ستاتے، مارتے اور پیٹتے، تکلیف پہونچانے اور ستانے کے ایسے نت نئے طریقے ایجاد کرتے کہ جن کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں: ''قریش نے جور وظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے، جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ ریتیلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ

ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کرکے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے“۔ [سیرت النبی، علامہ شبلی نعمانی، ۱/۱۷۱-۱۷۲]

ستانے والے سمجھتے تھے کہ اس قدر تکلیفوں اور مشقتوں کے بعد یہ بیکس و بے آسرا مسلمان ہمت ہار بیٹھیں گے، نئے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ منقطع کرلیں گے، اور واپس ان کے آباواجداد کے دین پر چلنے لگیں گے، لیکن ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی، ہزار ظلم وستم اور تعذیب کے بعد بھی یہ صاحبانِ ایمان صبر واستقامت کی عجیب حیرتناک مثال قائم کرتے، ہر طرح سے ستائے جانے اور مارے پیٹے جانے کے بعد بھی ان کی زبان سے نغمۂ توحید ہی جاری ہوتا، اور نور ایمان کے ملنے کے بعد کفر کی تاریکی میں لوٹنے پر وہ کسی طور تیار نہ ہوتے، صبر واستقامت اور قربانیوں کی یہ بے نظیر مثالیں جن صاحبانِ ایمان نے پیش کی تھیں ان میں مردوں کے ساتھ خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔

حضرت حمامہ رضی اللہ عنہا

حضرت بلالؓ کے ساتھ ہونے والے مظالم کو تو سب جانتے ہیں، لیکن کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت حمامہ کو بھی انھیں جیسے حالات سے گزرنا پڑتا تھا، اور وہ بھی کسی صورت اللہ کے دین کو ترک کرنے اور رسول اللہ سے رشتہ توڑ لینے پر راضی نہ ہوتیں، حضرت بلالؓ کی طرح ان کو بھی اس ظلم وستم سے نجات تبھی ملی جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا۔ [الاصابة في تمييز الصحابة، ابن حجرؒ، ۸/۸۸]

حضرت لبینہ رضی اللہ عنہا

بالکل ابتدائی عہد میں اسلام لانے والی صحابیات میں ایک نام حضرت لبیبہ (یا لُبَینہ) کا تھا، یہ بھی ایک باندی تھیں، دیگر مسلم غلاموں اور باندیوں کی مانند انھیں بھی بدترین ظلم کا نشانہ بننا پڑتا [الاصابة في تمييز الصحابة، ابن حجرؒ، ۸/۸۸]، حضرت عمر کا زمانۂ کفر تھا، وہ ان کو بری طرح زدوکوب کرتے، حضرت حسان بن ثابت کا بیان ہے کہ: ”میں عمرہ کی نیت سے مکہ حاضر ہوا، ان

دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت دے رہے تھے، اور آپ کے صحابہ ستائے جارہے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ (جو ابھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئے تھے) ان (حضرت لبیبہؓ) کو بری طرح مار پیٹ رہے ہیں، بالآخر وہ بیہوش ہوکر گر پڑیں، مجھے تو لگا کہ وہ وفات پا گئیں، اس حالت میں حضرت عمرؓ نے ان کو چھوڑا اور حضرت زنیرہؓ کو زدوکوب کرنا شروع کردیا"۔[انساب الاشراف، بلاذری، مطبوعہ: دارالفکر، بیروت، ص:۱/۲۲۱]

حضرت زِنّیرہ رضی اللہ عنہا

حضرت زِنّیرَہ رومیہ قریش کے قبیلۂ بنی مخزوم میں باندی تھیں، ان کا شمار اولین صحابیات میں ہوتا ہے، اسلام لانے کی پاداش میں خود ابوجہل ان کو ستاتا، مارتا اور پیٹتا، (غالبا) اسی ظلم وستم سے ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی، قریشِ مکہ نے کہنا شروع کیا کہ لات وعزیٰ (دو بتوں) نے ناراض ہوکر ان کو نابینا کردیا، قریش کے اس دعوے کی خبر ان کو ہوئی تو فرمایا: لات وعزی کیا جانیں کہ کون ان کی عبادت کرتا ہے اور کون نہیں، یہ تو اللہ کے کرنے سے ہوا ہے اور وہ چاہے تو میری روشنی واپس بھی آسکتی ہے، اللہ نے اپنی بندی کے ان جملوں کی لاج رکھی، اگلی صبح وہ بیدار ہوئیں تو ان کی آنکھوں کی روشنی واپس آچکی تھی۔[اسد الغابة في معرفة الصحابة، ابن اثیرؒ، ۱۵۲۲، مطبوعہ: دار ابن حزم، بیروت۔ الاصابة في تمييز الصحابة، ابن حجرؒ، ۸/۱۵۰-۱۵۱]

حضرت ام عبیسؓ اور حضرت نہدیہؓ

حضرت ام عبیس اور حضرت نہدیہ بھی ان اولین مسلم خواتین میں تھیں جنھیں قریشِ مکہ کے ہاتھوں بدترین ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے صبر واستقامت کی بے نظیر مثال پیش کی اور اللہ کے دین پر استقامت کی روش اختیار کی۔[انساب الاشراف، بلاذری، ص:۱/۲۲۲]

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا

خواتین اسلام کی داستانِ صبر واستقامت میں حضرت سمیہ کا نام نہایت جلی حروف سے تحریر کیا

جاتا ہے، وہ بنومخزوم کے ایک شخص ابوحذیفہ کی باندی تھیں، ان کے شوہر حضرت یاسرؓ یمن سے تعلق رکھتے تھے، مکہ میں آکر مقیم ہوئے اور ابوحذیفہ کی اِن باندی (حضرت سمیہؓ) سے شادی ہوئی، ان دونوں کے صاحبزادے معروف صحابی حضرت عمار بن یاسر تھے، تین افراد پر مشتمل یہ پورا خانوادہ سابقینِ اولین میں سے ہے (یعنی ان صحابہ میں سے ہے جو بالکل ابتدا میں اسلام لائے)، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے بعد یہ غالبا وہ پہلا گھر تھا جس کے تمام افراد نے اسلام قبول کیا تھا، بنومخزوم ان تینوں کو بہت ستاتے، جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے، اتنا مارتے کہ یہ بیہوش ہو جاتے، اسی حالت میں ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو، کہ تمھارا ٹھکانہ جنت ہے''۔ [مستدرک حاکم، ذکر مناقب عمار بن یاسر] پھر ایک روز ابوجہل نے حضرت سمیہ پر برچھی سے ایسا حملہ کیا کہ وہ شہید ہوگئیں، جماعتِ صحابہ اور تاریخِ اسلام میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہونے والی یہ پہلی شخصیت تھی، ان کے صبر واستقامت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جس وقت قریشِ مکہ کے ہاتھوں یہ تمام تکلیفیں اٹھائیں اس وقت وہ نہایت عمر دراز اور کمزور وناتواں تھیں۔ [سیرت ابن اسحاق: مطبوعہ: دارالکتب العلمیۃ، ۱/۲۲۹۔ الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، ابن حجرؒ، ۸/۱۸۹-۱۹۰]

دین کی خاطر قربانی کی ایک نئی صورت:

کمزور و بے آسرا قسم کے مسلمانوں پر ظلم وستم کا یہ سلسلہ ۴ نبوی کے درمیانی یا آخری حصہ میں شروع ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ زور پکڑتا گیا، ۵ نبوی کے درمیانی حصہ میں ان اہلِ ایمان کی آزمائش اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ مکہ مکرمہ میں اکثر اہلِ ایمان کے لیے رہنا مشکل ہوگیا، بالآخر آں حضرتؐ نے اہلِ ایمان کو اجازت دی کہ جو ہجرت کرکے حبشہ جاسکے چلا جائے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: السیرۃ النبویۃ فی ضوء المصادر الأصلیۃ، ڈاکٹر مہدی رزق اللہ، مطبوعہ: ریاض، ص: ۱۹۶-۱۹۷]

اس کے بعد مختلف اوقات میں متعدد صحابہ وصحابیات نے اپنے دین پر آزادانہ عمل کرنے کے لیے اپنے محبوب وطن کو، اپنے خاندان کو اور مکہ مکرمہ کے قیام کو چھوڑا، اور ایک مختلف تہذیب وزبان کے ملک میں مجبوراً پناہ لی، حبشہ ہجرت کرنے والے تمام صحابہ نے ایک ساتھ ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ

متعدد قسطوں میں صحابہ وصحابیات کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے ہجرت کی، اولین ہجرت سنہ ۵ نبوی میں ہوئی، ابن سعد کے بیان کے مطابق اس میں گیارہ مرد اور چار خواتین (جگر گوشۂ رسول حضرت رقیہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت سہلہ بنت سہیل اور حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ) تھیں، [ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، مطبوعہ: مکتبہ خانجی، قاہرہ، ص: ۱۷۳-۱۷۴] پھر کچھ مدت بعد مزید افراد نے ہجرت کی، تو ان میں ۱۸ خواتین بھی تھیں، جن میں گیارہ قریشی اور سات غیر ملکی تھیں۔ [ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ص: ۱۷۶]

یہ ہجرت کوئی آسان کام نہ تھا، اس کے نتیجہ میں اپنے گھر، خاندان، اہل تعلق اور محبوب وطن کو خیر باد کہنا تھا، اور سب سے زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے جسمانی دوری بھی لازم آتی تھی جو ان مصیبت زدگان کے لیے ایک مشفق سرپرست وراہنما تھے اور جن کا وجود ہر غم کا مداوا اور جن کی ایک نگاہ شفقت ہر درد کی دوا تھی، لیکن اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لیے ان مہاجرین نے یہ نہایت مشکل فیصلہ کیا تھا۔

عام طور پر ہمارے یہاں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ، حبشہ پہنچ کر تمام پریشانیوں سے نجات پاگئے، اور ان کی زندگی نہایت مطمئن اور خوشحال گزری، حقیقت یہ نہیں ہے، یہ تو سچ ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ قریش کی مخالفت سے محفوظ ہوگئے تھے، انھیں اپنے دین پر عمل کی آزادی مل گئی تھی، لیکن اس کی قیمت انھیں بہت بڑی ادا کرنی پڑی تھی، انھیں معاشی مسائل کا سامنا تھا، مکہ میں بہرحال اہلِ ایمان کی ایک جماعت تھی، جو باہم ایک دوسرے کی مدد کرتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات تھی، جو غریبوں کی پرسانِ حال ہوتی، بھوکوں کو کھلاتی، اور بے سہاروں کا سہارا بنتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ میں نئی نئی آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں، جو اہلِ ایمان کی ڈھارس بندھاتیں، ان کے ایمان میں اضافہ کرتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلسیں ہوتیں جہاں حاضر ہوکر ہر غم کا مداوا ہو جاتا، ہر زخم پر مرہم لگ جاتا، مہاجرینِ حبشہ ہجرت کے نتیجہ میں ان سب سے محروم ہوگئے۔

ہجرت کے نتیجے میں مہاجرینِ حبشہ کو جو قربانی پیش کرنی پڑی تھی (جس کا کچھ تذکرہ پچھلی سطروں

میں گزرا) اس کا پتہ ہمیں متعدد روایات سے چلتا ہے، جن میں سے دو کا تذکرہ ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

حضرت عثمان ان اولین صحابۂ کرام میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے حبشہ ہجرت کی تھی، کچھ ہی مدت گزری تھی کہ حبشہ میں یہ غلط خبر پہنچی کہ مکہ کے حالات موافق ہو گئے ہیں، اب وہاں بھی آزاد ماحول میں دین پر چلنا ممکن ہے، نتیجتاً حضرت عثمان (اور بعض دیگر حضرات) مکہ واپس آ گئے، آ کر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، حالات بدستور شدید ناموافق ہیں، مجبوراً حضرت عثمان نے واپسی کا ارادہ کیا، واپسی کے وقت انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! پہلی ہجرت نے بھی آپ سے دور کیا تھا، اور اب اس دوسری ہجرت میں بھی آپ کی مہجوری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: تمھاری ہجرت اللہ اور میری جانب ہی ہے [ابن سعد، الطبقات الکبری، ص:۱۷۶]۔ اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مہاجرین کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جیتے جی آپ سے دوری و مہجوری کا احساس کیسا غمناک و کربناک تھا!!! اُن کے اِس درد کا احساس ہر وہ شخص کر سکتا ہے جسے ایمان و محبت سے کچھ حصہ ملا ہو۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ایک طویل روایت کے چند جملے بھی اس موقع پر قابلِ ذکر ہیں جن سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو حبشہ میں کن مسائل کا سامنا تھا، اس روایت میں درج ہے کہ حبشہ کی اولین ہجرت میں شریک حضرت اسماء بنت عمیس نے ایک موقع پر حضرت عمرؓ سے کہا تھا: ''آپ لوگ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے، آپ میں سے کوئی بھوکا ہوتا تو وہ اس کے کھانے کا انتظام کرتے، کوئی جہالت کا رویہ اختیار کرتا تو وہ اس کو سمجھا دیتے، ہم حبشہ میں جہاں تھے وہاں سب ہمارے بیگانے اور ہم سے بیزار تھے۔'' [صحیح بخاری: کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر، حدیث نمبر: ۴۲۳۰۔ صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل جعفر بن ابی طالب واسماء بنت عمیس، حدیث نمبر: ۲۵۰۳] اس روایت کے یہ چند جملے پورا حال بیان کر دیتے ہیں، اِن کی روشنی میں بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حبشہ میں مہاجرین نے اپنے دین پر عمل کی آزادی تو پائی تھی، لیکن اس کے بدلہ میں تیرہ برس سے زائد کا عرصہ نہایت تکلیفوں اور قربانیوں کے

ساتھ گزارا تھا، یہ قربانی صرف وطن و خاندان سے دوری کی نہ تھی، ایک طویل عرصہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہجوری، فقر و فاقہ اور ہمدردوں و غمخواروں سے محروم ہونے کی تھی، اور اس قربانی میں مرد صحابہ کے ساتھ خواتین صحابیات کی ایک تعداد بھی شامل تھی۔

مکی عہد میں دعوت اور مسلم خواتین:

پورے مکی عہد بالخصوص اس کے ابتدائی عہد میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا نہایت خطروں بھرا کام تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ صحابہ وصحابیات بھی لوگوں کو اسلام کی جانب بلاتے، اوران کی دعوت پر متعدد افراد اسلام قبول کرتے، اور یوں رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا، صحابہ میں سے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اہلِ تعلق میں بڑی کامیابی حاصل کی، ان کی دعوت پر حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد الرحمان بن عوف، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسد اور حضرت ارقم بن ابی الارقم جیسے عظیم صحابہ ایمان لائے۔ [السیرۃ النبویۃ في ضوء المصادر الأصلیۃ، ڈاکٹر مہدی رزق اللہ، ص:۱۵۸]

حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا

خواتین بھی اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کے کام میں سرگرم رہتیں، اور تمام خطرات کے باوجود اللہ کی بندیوں کو اللہ کی جانب بلانے میں لگی رہتیں، اس عہد کی داعی صحابیات میں ایک نام حضرت ام شریک اسدیہؓ کا ہے، وہ اپنے شوہر کے ساتھ مکہ میں رہتی تھیں، ان کا اپنا قبیلہ مکہ سے دور آباد تھا، اسلام لانے کے بعد انھوں نے مکہ کی خواتین کو نہایت خفیہ اور رازدارانہ طور پر دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا، کچھ مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا، لیکن پھر یہ راز افشا ہوگیا، اور مکہ کے دشمنانِ اسلام کو ان کی دعوتی سرگرمیوں کی خبر لگ گئی، وہ چراغ پا ہوگئے، لیکن انھیں حضرت ام شریک کے قبیلہ بنو اسد کا خیال ہوا، اس لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ام شریک کو زدوکوب تو نہ کیا جائے، لیکن انھیں اب مکہ میں بھی رہنے نہ دیا جائے، بلکہ

انھیں ان کے قبیلہ پہنچا دیا جائے، چنانچہ چند افراد کے ہاتھ ان کو ان کے قبیلہ روانہ کر دیا گیا۔

اس سفر میں ان کو سخت اذیت دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا خاص فضل فرمایا، خود ام شریک کا بیان ہے کہ انھوں نے مجھے جس اونٹ پر سوار کیا اس پر کوئی کجاوہ نہیں رکھا، اونٹ کی ناہموار اور سخت کمر پر بغیر کجاوہ کے سفر نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے، اسی طرح ان کو اس طویل سفر کے لیے روانہ کیا، جب کہیں راستہ میں اترتے تو خود تو سایہ میں لیٹتے، لیکن ام شریک کو تپتی دھوپ میں چھوڑ دیتے، کھانے پینے کو بھی کچھ نہ دیتے، اسی حال میں تین روز گزر گئے، حجاز کی سخت دھوپ میں لگاتار تین دن بے کچھ کھائے پیے رہنے سے ام شریک کی حالت غیر ہوگئی، وہ تقریباً بے ہوش ہوگئیں، اسی حال میں یہ قافلہ ایک جگہ رکا، انھیں حسب معمول دھوپ میں چھوڑ دیا گیا اور ساتھ کے لوگ خود سایہ میں جا کر آرام کے لیے لیٹ گئے، ام شریک کہتی ہیں: ''میں دھوپ میں لیٹی (یا پڑی) ہوئی تھی کہ مجھے اپنے سینے پر ایک ٹھنڈی چیز کا احساس ہوا، دیکھا تو ایک ڈول تھا، میں نے اس سے تھوڑا پانی پیا، پھر وہ اوپر کی جانب اٹھ گیا، پھر کئی بار یہ ڈول اسی طرح میرے پاس آیا، ہر مرتبہ میں اس کا پانی پی لیتی، یہاں تک کہ میں سیراب ہوگئی، پھر میں نے پورا ڈول اپنے اوپر ڈال لیا،...... کچھ دیر کے بعد جب وہ بیدار ہوئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے ہمارا پانی استعمال کیا ہے، میں نے کہا نہیں، پھر میں نے ان کو پوری بات بتائی،...... یہ جان کر وہ سب مسلمان ہوگئے [حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم الاصفہانی، مطبوعہ: بیروت، ص: ۲/۶۷-۶۶۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ابن حجرؒ، ۸/۴۱۸-۴۱۷]۔

رازداری:

مکہ مکرمہ میں حالات جس طرح کے نازک اور سنگین تھے ان کی وجہ سے رازداری بہت اہمیت رکھتی تھی، تقریباً اس پورے عرصہ میں دعوتی سرگرمیاں رازداری کے ساتھ جاری رہتیں، اس لیے کہ ان کو علانیہ انجام دینا قریش کی آتشِ غضب کو بھڑکانا، مسلمانوں کو خطرات میں ڈالنا اور دعوت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا، اسی لیے اس عہد میں رازداری کا بہت اہتمام کیا گیا، کیا مرد کیا خواتین، سبھی مسلمان رازداری کا بے حد خیال رکھتے، دشمنانِ دین ہر وقت یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ آپؐ سے کون مل رہا ہے؟ اور مسلمان کس کو دعوت دے رہے ہیں؟ لیکن مسلمان رازداری کا اہتمام کر کے بالعموم ہر اس خبر کو ان تک جانے سے روک دیتے جس کا ان تک پہنچنا دین و دعوت یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لیے کسی طرح بھی نقصان دِہ ہو سکتا تھا، اس سلسلہ میں خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہ تھیں، بسا اوقات ان خواتین سے راز افشا کرانا چاہا گیا لیکن انھوں نے کسی قیمت پر ایسا نہیں کیا، اس سلسلہ میں دو واقعات یہاں درج کیے جاتے ہیں جن سے حضرات صحابیات کے یہاں رازداری کے اہتمام کا پتہ چلتا ہے:

حضرت فاطمہ ام جمیل رضی اللہ عنہا

مکی عہد کے ابتدائی دور کی بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی کوششوں سے ایمان لانے والوں کی تعداد اڑتیس ہوگئی، حضرت ابو بکرؓ کا اصرار ہوا کہ اب ہم قابلِ ذکر تعداد میں ہیں، لہٰذا علانیہ دعوت کا آغاز کر دینا چاہیے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مختلف تھی، آپ ابھی بھی علانیہ دعوت کو مناسب خیال نہیں کرتے تھے، لیکن حضرت ابو بکرؓ کے اصرار پر آپ نے اجازت مرحمت فرمادی، ایک دن جب کہ قریش کی بڑی تعداد خانۂ کعبہ کے پاس تھی، حضرت ابو بکرؓ نے بصورتِ خطاب اسلام کی دعوتِ عام دی، پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، ظالموں نے حضرت ابو بکرؓ پر حملہ کر دیا، اتنا مارا کہ بیہوش ہوگئے، چہرہ پر سخت چوٹیں آئیں، کسی طرح آپ کے قبیلہ کے چند افراد نے جان بچائی، اور آپ کو آپ کے گھر پہنچایا، گھر پہنچ کر بھی آپ بیہوش ہی رہے، شام کو ہوش آیا تو پہلا جملہ زبان سے یہ نکلا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟ گھر والے ابھی تک کافر ہی تھے، یہ سن کر غصہ ہوگئے کہ اس حالت میں بھی دھن وہی ہے، والدہ نے چاہا کہ کچھ کھلا دیں، لیکن ہر بات کے جواب میں آپ کا وہی ایک سوال تھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟ آخر ماں نے کہا مجھے نہیں معلوم، آپ نے فرمایا: ام جمیلؓ بنت خطاب سے پوچھ کر آئیے کہ رسول اللہ کس حال میں ہیں؟ وہ ام جمیلؓ کے پاس آئیں، اور ان سے بولیں: ابوبکر محمد بن عبداللہ کا حال دریافت کر رہے ہیں؟ یہ ام جمیلؓ حضرت عمر کی بہن حضرت فاطمہ تھیں، جو بالکل ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک تھیں، انھوں نے

حالات کی نزاکت کے پیش نظر ایک کافر خاتون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا، اور راز داری کے خیال سے یوں کہا: مجھے ابوبکر اور محمد بن عبد اللہ کی کیا خبر؟ مجھے کچھ نہیں معلوم، اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے کے پاس چلی چلوں، اس طرح وہ حضرت ابوبکر کے یہاں پہنچیں، ان کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ اب بھی پاس میں ہی تھیں، ام جمیلؓ نے ان کے سامنے بتانے سے احتیاط کی، تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ان سے راز داری کی ضرورت نہیں، ان کا یہ جواب سن کر حضرت ام جمیل نے عرض کیا: مکمل خیر و عافیت کے ساتھ ہیں، اور دار ارقم میں ہیں،......[البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، تحقیق ڈاکٹر عبد اللہ بن عبد المحسن ترکی، مطبوعہ: دار ہجر، ص:۷۶-۷۷]

اس واقعہ میں ہم کو مکی عہد میں مسلم خواتین کے یہاں راز داری اور عزم و وفا کی ایک شاندار مثال نظر آتی ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ اس عہد کی مسلم خاتون کیسی ذمہ دار، راز دار اور سمجھدار و وفادار تھی!

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا

مسلم خواتین کے ذریعہ راز داری کے پاس و لحاظ کی ایک اور مثال عین ہجرت نبوی کے وقت کی ہے، مشہور واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے ساتھ مکہ سے نکلے اور غارِ ثور میں تین دن کے لیے روپوش ہوگئے، تاکہ سفرِ ہجرت جب شروع ہو تو مکہ کے لوگ آپ کی تلاش و جستجو سے مایوس ہو چکے ہوں، اُدھر کفار مکہ کو جب خبر ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں نہیں ہیں، تو وہاں ایک شور بپا ہوگیا، ابوجہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت ابوبکر کے گھر آیا، صاحبزادی حضرت اسماء باہر آئیں، اس نے نہایت سختی کے ساتھ دریافت کیا کہ تمھارے والد کہاں ہیں؟ حضرت اسماء کو خبر تھی کہ وہ غارِ ثور میں ہیں، لیکن انھوں نے راز فاش نہ کیا، خود حضرت اسماء کہتی ہیں کہ ابوجہل نہایت بدگو و بدطینت انسان تھا، اس نے میرے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میری کان کی بالی دور جا گری، لیکن پھر بھی انھوں نے راز کو راز رکھا، اور اس کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہیں، [البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، ص:۷۴۴] غور کریئے کہ کس نازک موقع پر حضرت اسماء کی راز داری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

حضرت ابوبکر کو قریش کی گرفت میں جانے سے بچالیا، قریش مکہ کے ایک گروہ نے ابوجہل کی سرکردگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا تھا، اس کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا، اگر اس موقع پر ابوجہل کے ذریعہ زدوکوب کیے جانے کے بعد حضرت اسماء حوصلہ ہارگئی ہوتیں، اور راز فاش کردیتیں تو خدا جانے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا ہوتا؟ لیکن ان کی ہمت اور ان کی رازداری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور دین وملت کو کسی انہونی سے بچالیا۔

پچھلے صفحات میں تاریخِ اسلام کے ابتدائی برسوں (یعنی حیاتِ نبوی کے مکی عہد) کی بابت جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں یہ بات بہت آسانی کے ساتھ سمجھی جاسکتی ہے کہ: اس عہد میں اسلامی دعوت اور مسلم معاشرہ کی خدمت کی جتنی بھی جہتیں ہوسکتی تھیں اس عہد کی خواتین ان تمام جہتوں میں اپنی تعداد واستطاعت کے بقدر اپنا کردار ضرور ادا کرتی تھیں، وہ خدمتِ دین وملت کے ہر شعبہ میں اپنا سرگرم کردار رکھتی تھیں؛ غیر مسلموں بالخصوص غیر مسلم خواتین کو دعوت دیتیں، مکہ کے غیر مسلم مشتعل وبرہم ہوتے تو یہ خواتین ان کے سامنے چٹان کی مانند کھڑی ہوجاتیں، ظلم وستم کی ہر واردات کے سامنے صبر واستقامت کا پہاڑ بنتیں، مکہ میں رہ کر دین پر آزادانہ عمل ممکن نہ ہوتا اور دینی مصلحت ہجرت کی متقاضی ہوتی تو اس سے بھی پیچھے نہ رہتیں، اور مسلمانوں کا جو راز ان کے سینوں میں ہوتا یہ اس کو فاش نہ کرتیں، خواہ اس کی کوئی قیمت بھی ان کو کیوں نہ ادا کرنی پڑتی۔

خواتین کا یہی کردار مسلم تاریخ کے روشن دور کے ہر مرحلہ میں پایا جاتا ہے، وہ وقت کے ہر دینی تقاضے پر لبیک کہتیں اور اس کی بابت اپنی خدمات پیش کرنے اور اپنا کردار ادا کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتیں، عہدِ حاضر کی مسلم خواتین کے لیے ہماری تاریخ کے روشن دور کا یہی اسوہ ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ انسانی آبادی کے اس نصف حصہ کی خدمات کے بغیر کسی دینی شعبہ میں بڑی کامیابی کی کوئی پائیدار امید نہیں رکھی جاسکتی۔ اس مضمون کی اگلی قسطوں میں ان شاء اللہ تاریخ اسلامی کے اگلے مراحل میں وقت کے دینی تقاضوں کی تکمیل کے سلسلہ میں خواتینِ اسلام کے کردار کا تذکرہ کیا جائے گا۔

(جاری)